سترہویں صدی عیسوی کی اُردو غزل میں تصورِ انسان

سیدہ روحینہ جعفری ایسوسی ایٹ پروفیسر، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر حمیرا ارشاد، پروفیسر شعبہ اردو، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

Language and literature are considered as an intellectual pulse of a region. In the reflection of this mirror, one can understand the culture and intellect of an era, region, or nation, and can identify the flux of its social psychology and values. Urdu language and literature are flag bearers of thoughts and values of the Indo-Islamic culture in the subcontinent. It not only reflects Indian and Islamic philosophy and religion but also Persian, Turk, and Greek perspectives. Although initial remnants of Urdu Ghazal could be found in the writings of Amir Khusraoo, it received a proper form in the seventeenth century AD. When in a specific environment of the governmental parentage, Urdu poetry and literature were developed and promoted in Dakkan. As compared to Masnawai, Ghazal of this era did not bear any capable mention of intellectual thoughts. Poets of this time have written very few Ghazals. As these Ghazals are limited to expressions about and dialogue with the Women. Hence, these early Ghazal poets could be categorized as romantic poets. However, the only exception of this time is Wali Dakkani. Wali appears as a classic in this century. Serious and comprehensive thought about the value and dignity of a human, and his moral and intellectual position and standing could be found in Wali’s expression. Which is strongly influenced by the philosophy of Sufism. While his contemporaries’ expression about the concept of

human spans only one or two couplets in their entire poetic collections. In the subsequent centuries, Urdu poetry has received a significant influence from Wali's thoughts on this topic.

فکرِ انسانی ابتدا ہی سے انسان اور اس کے ارد گرد موجود اشیا کی ماہیت اور مقصدیت و معنویت پر غور کرتی آئی ہے۔ علمی ترقی کے ساتھ اگرچہ فکر کا دائرہ وسیع ہوتا گیا مگر بنیادی سوالات جوں کے توں موجود ہیں۔ انسان، کائنات اور خدا؛ اور ان کا باہمی تعلق؛ وہ بنیادی موضوعات ہیں جن پر غور و فکر انسان کے تمام تر علمی اور فکری ارتقا کی بنیاد ہے۔

ہندوستان کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ ۱۵۰۰ ق م میں آریائوں کی آمد اس سر زمین کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہیں سے ہندوستان کی معلوم تاریخ کا آغاز بھی ہوتا ہے*۔ آریائوں نے یہاں بود و باش اختیار کرنے کے بعد جو مذہبی عقائد اور رسوم اختیار کیے اور متعارف کرائے؛ رگ وید ان کا مجموعہ ہے۔ یہیں سے ہندو مت کا آغاز ہوا۔ ان عقائد کے نتیجے میں معاشرہ چار طبقوں میں تقسیم ہو گیا۔ نچلے درجے کے انسانوں کو بحیثیت انسان جینے کی اجازت نہ تھی۔ اس صورتِ حال کے ردِ عمل کے طور پر گوتم بدھ (۵۶۳ ق م) اور مہاویر (۵۹۹ ق م) نے بالترتیب بدھ مت اور جین مت کی بنیاد رکھی۔ یہ مذاہب احترامِ آدمیت پر زور دیتے اور عدم تشدد کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کو نچلے طبقے میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آریائوں کے بعد سکندرِ اعظم (۳۲۵ ق م) کے ہندوستان پر حملے کے نتیجے میں یونانی تہذیب و تمدن اور فلسفہ ہندوستانی فکر کا حصہ بنا۔ بعد ازاں مسلمانوں کے حملوں کے نتیجے میں قائم ہونے والی ملک گیر حکومتوں کے سبب اسلامی فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن، مقامی فکر و فلسفہ اور طرزِ احساس پر اثر انداز ہوئے۔ یوں اس خطے میں مختلف رنگوں، نسلوں، تہذیبوں اور مذاہب کے ادغام سے ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوئی جس نے اس سر زمین کے علمی، فکری، روحانی اور تہذیبی ارتقا میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہندو مت اور اسلام دو ایسے مذاہب ہیں جو اس خطے میں صدیوں تک شانہ بشانہ پنپتے رہے اسی بنا پر برِ عظیم کی تہذیب کو ہند اسلامی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ اُردو زبان و ادب اسی تہذیب کا ثمر نورس ہے۔

زبان و ادب کسی بھی معاشرے کی شعوری نبض کا مقام رکھتے ہیں۔ یہ اپنے دامن میں معاشرے کی سوچ، اخلاقی اقدار، مذہبی عقائد، علمی کمالات اور طرزِ احساس سبھی کچھ لیے ہوتے ہے۔ اردو زبان کا کلاسیکی ادب بیشتر شاعری پر مبنی ہے جس میں غزل کو بطورِ خاص اہمیت حاصل ہے۔ اُردو زبان و ادب کا دورِ کمال اٹھارہویں صدی عیسوی سے آغاز ہوتا ہے اور انیسویں

صدی عیسوی کے وسط تک تخلیق ہونے والے ادب کو کلاسیک کا درجہ دیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ستر ہویں صدی عیسوی کی اُردو غزل میں انسان کے حوالے سے پائے جانے والے تصورات کا ایک جائزہ مرتب کیا گیا ہے۔

مختلف انسانی تہذیبوں، عقائد اور فکر و فلسفہ و تصوف کے اختلاط سے اُبھرنے والے تصورِ انسان کی اہمیت اس دور میں یوں بڑھ جاتی ہے کہ موجودہ دور اخلاقی، علمی، مذہبی، سماجی اور سیاسی زوال کا دور ہے۔ آج کے دور میں انسانیت سے اعتبار اُٹھتا جارہا ہے اور بحثیت انسان زندگی گزارنا دشور تر ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے ادب میں عالمی سطح پر انسان کو بطورِ خاص موضوع بنایا گیا ہے اور آج کے حساس ذہنوں نے انسان کی عظمت اور کائنات میں اس کی حیثیت کو اُجاگر کرتے ہوئے انسانیت اور اس کے تقاضوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ زوال آمادہ معاشرے میں انسانیت کا بھرم قائم رکھا جاسکے۔

ستر ہویں صدی میں اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی دو دکنی ریاستوں قطب شاہی اور عادل شاہی میں اپنے عروج پر تھی۔ دکن میں گجرات ہو یا بہمنی سلطنت اور بعد ازاں یہ دونوں ریاستیں ، یہاں کے حکمران شعوری طور پر مغل تہذیب و تمدن کے مقابلے میں مقامی عناصر کی آمیزش سے ایک منفرد تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کی کوششوں میں رہے ،اسی سبب سے یہاں فارسی زبان کی نسبت مقامی زبان جسے دکنی کا نام دیا جاتا تھا، زیادہ پھلی پھولی یہی وجہ ہے کہ یہاں دکنی ہی ادبی زبان کے طور پر رائج ہے4 اور حکمران بھی اسی زبان میں ادب تخلیق کر رہے۔ ان ریاستوں میں آسودہ حالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا اور ستر ہویں صدی تک آتے آتے ان ریاستوں کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامہ واضح ہو کر روایت کا درجہ حاصل کر چکا تھا یہاں کی ثقافت میں ایرانی، مغل اور مقامی ہندی روایات کا واضح اثر تھا۔ مذہب کو یہاں کی زندگی کا جزوِ لاینفک خیال کیا جاتا تھا چنانچہ یہاں کی اصنافِ شعر و نثر میں مذہبی اور صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ آسودہ حالی کی وجہ سے عوام و خواص زیادہ تر ثقافتی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ رقص و موسیقی کی محفلیں اور جشن وغیرہ روز مرہ زندگی کا حصہ تھے۔ قطب شاہی عہد میں محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء۔۱۶۱۱ء) کا دور ثقافتی سر گرمیوں اور زبان و ادب کے اعتبار سے دورِ عروج قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

شاہی سرپرستی کی وجہ سے بڑے بڑے علماء نے اُردو کو ذریعۂ اظہار کے طور پر اپنایا۔

منگل کے روز تعطیل ہوتی، تمام دن علمی مجالس منعقد ہوتیں اور مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر مباحثے کیے جاتے۔

طرحی غزلوں کے مشاعرے منعقد کیے جاتے۔

عادل شاہی عہد میں ثقافتی سر گرمیوں اور زبان و ادب کے اعتبار سے ابراہیم عادل شاہ (۱۵۳۴ء۔۱۶۲۶ء) کا دور بہت اہم ہے۔ اسے ذاتی علم و فضل کی وجہ سے ''جگت گرو'' کہا جاتا تھا۔

اس دور میں فارسی کی جگہ اُردو کو دفتری زبان کے طور پر رائج کیا گیااور بیجاپور اُردو کا مرکز بن گیا۔ اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔

زبان وادب کے علاوہ فنِ موسیقی، فنِ تعمیر اور علومِ دینی کو بھی بہت ترقی ہوئی۔ان دونوں ریاستوں میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی اصنافِ نظم ونثر میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔یہاں کی مقبول ترین صنف مثنوی رہی۔دیگر اصناف میں غزل ،قصیدہ، مرثیہ، کبت، گیت، رباعیات اور دوہے وغیرہ کو برتا گیا۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے اس میں ہندی روایات کے زیرِ اثر مرد کے ساتھ ساتھ اکثر اوقات عورت کی طرف سے بھی اظہارِ عشق کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ریختی کا پہلا دیوان بھی دکن ہی میں مرتب ہوا. یہاں کے کم وبیش تمام شعراء کے ہاں ایسی غزلیات ملتی ہیں جن میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ہوا ہے۔یہاں تک کہ ولی دکنی کے ہاں بھی ایسی غزلیات موجود ہیں۔

"دکنی روایت کی شعری توانائی کا منبع عورت اور اس کا عشق ہے. دکنی روایت جسمانی عشق کے ہزار شیووں، جذبوں اور شاد کامیوں سے لبریز نظر آتی ہے۔چونکہ اس روایت کی ساری توجہ بدنی مسرتوں کے حصول میں ہے اس لئے یہ شاعری فکر اور روح کے تجربات سے عاری ہے۔"[۱]

صنفِ غزل پر تو یہ رائے بہت حد تک صادق آتی ہے مگر دیگر اصناف مثلاً مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ میں فکری اور روحانی تجربات کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ذیل میں اس دور کے اہم شعرا کی غزل کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حسن شوقی (وفات: ۱۶۳۳ء)

حسن شوقی دکنی غزل کی روایت کا ایک بہت اہم نام ہے۔اس کو دکن کے تین درباروں نظام شاہی، قطب شاہی اور عادل شاہی سے وابستگی رہی۔اس نے مثنویاں بھی لکھیں جن میں "فتح نامہ نظام شاہ" احمد نگر میں اور "میزبانی نامہ عادل شاہ" بیجا پور میں لکھی گئی. اس نے اعلیٰ پائے کی غزلیات کہیں جو تعداد میں ۳۲ ہیں۔اتنی قلیل تعداد کے باوجود غزل کے میدان میں اس کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے:

"حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کا حصہ ہیں جس کے فراز پر ولی دکنی کی غزل کھڑی ہے ۔یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ و روپ کا حصہ ہیں ۔حسن شوقی کے ذہن میں غزل کا واضح تصور ہے۔وہ غزل کو عورتوں کی باتیں کرنے اور عورتوں

سے باتیں کرنے کا ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔اس کی غزلوں کا بنیادی تصور یہی ہے۔ وہ غزل میں جذباتِ عشق کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اور عشقیہ جذبات کے مختلف رنگوں اور کیفیات کو غزل کے مزاج میں گھلاتا ملاتا نظر آتا ہے۔''۲

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ بیان فنی اور موضوعاتی دونوں حوالوں سے حسن شوقی کی غزل کا احاطہ کرتا ہے۔اس کی غزل میں محبوب کی ادائیں اور اس کا حسن و جمال اس انداز میں بیان ہوا ہے کہ ایک دلکش سراپا نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اگرچہ دکن کے معاشرے میں لذاتِ دنیوی کے ساتھ مذہب اور تصوف کا چلن عام ہے مگر حسن کی غزل میں مذہب یا تصوف کے نظریات کا گزر بالکل نہیں ہے،اس کی غزل اوّل تا آخر عشقِ مجازی، معاملاتِ عشق اور محبوب کے سراپے کے بیان پر مشتمل ہے۔البتہ غزل کے ایک شعر میں اس نے عظمتِ انسانی کا مضمون بڑے انوکھے رنگ میں باندھا ہے یہ انداز کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتا

ہمارے حال پر شوقی بجز حق کوئی واقف نئیں
کراماً کاتبیں مسکیں رہے حیراں قلم پکڑے۳

محمد قلی قطب شاہ(۱۵۶۵ء۔۱۶۱۱ء)

محمد قلی قطب شاہ ریاست گولکنڈہ کا پانچواں حکمران اور اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کا مالک تھا۔اس نے اپنے دورِ حکومت میں علما اور شعرا کی دل کھول کر سرپرستی کی۔وہ اُردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔اس کے کلام میں عربی اور عجمی تہذیب کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔اسے منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔اس نے غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، قطعات 9، نظم اور رباعی جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔اس کے ہاں موضوعاتی سطح پر بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک شاعری میں اس کی دلچسپی کے دو مرکز ہیں ایک مذہب اور دوسرا عشق۔

''غزل سے اس کی دلبستگی کا سبب یہ ہے کہ غزل کا موضوع عشق ہے اور قطب شاہ کے لئے شاعری کا محرک عشق اور صرف عشق ہے۔باقی باتیں ذیلی حیثیت رکھتی ہیں یا پھر جذبۂ عشق سے پیدا ہوتی ہے۔''۴

اس کی تمام تر توجہ موجودہ زندگی اور اس کی رنگینیاں ہیں ۔وہ مذہب کو بھی دنیاوی زندگی کو خوبصورت اور زیادہ رنگین بنانے کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہے. غزل کے اکثر مقطعوں میں وہ نبیؐ اور علیؑ کو مخاطب کرتا ہے اور زندگی کی لذتوں میں اضافے کی دعا کرتا ہے۔یعنی اس کا تصورِ حیات ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے مصداق ہے۔

غزل کے ایک شعر میں اس نے عظمتِ آدم کا ذکر کیا ہے, اس کے ساتھ کچھ اخلاقی نکات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

توں اندھیارے پنتھ میں نہ منگ روشنی اغیار تھے
روشنی تجھ دیوے کوں قدرت اجالے کا لگیا۵

اس شعر سے اپنی حقیقت سے واقفیت پیدا کرنا، خود پر بھروسہ کرنا اور کسی سے مدد طلب نہ کرنا جیسے اخلاقی نکات بھی اخذ ہوتے ہیں کیونکہ روحِ انسانی کا براہِ راست تعلق روحِ حق کے ساتھ ہے۔اس سے عقیدۂ توحید پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ صرف قادرِ مطلق ہی سے استمداد طلب کرنی چاہیے۔

مُلّا نصرتی (وفات:۱۶۷۴ء)

مُلّا نصرتی علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔یہ اُردو زبان کا ایک بلند مرتبہ شاعر تھا۔اس کا اصل میدان مثنوی نگاری ہے۔دیگر اصناف میں اس نے غزل، قصیدہ اور رباعی کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔اس کی غزلیات کی کل تعداد ۲۳ ہے۔

> ''جہاں تک نصرتی کی غزل کا تعلق ہے ،دکنی غزل کی روایت کے عین مطابق اس کی غزلوں کا موضوع بھی عورت ہے۔نصرتی نے اپنی غزلوں میں ان تمام عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے جو عام طور پر عشق میں پیش آتے ہیں اور مولانا حسرت موہانی کی اصطلاح میں نصرتی کا تصورِ عشق فاسقانہ ہے۔۔۔ نصرتی کی غزلوں میں اس لیے تخیّل، جذبہ اور معنی آفرینی کا وہ تخلیقی عمل، جو اس کی طویل نظموں کی خصوصیت ہے، نہیں ملتا کہ اسے شاہی کی پسند نے محدود کر دیا ہے ''۶۔

اس تبصرے کی روشنی میں نصرتی کی غزل میں فکری عناصر کے حوالے سے ایک واضح رائے قائم کی جاسکتی ہے۔اس کی غزلیات میں جہاں ایک آدھ جگہ کوئی اخلاقی نکتہ بیان بھی ہوا ہے تو وہ بھی معاملاتِ حسن و عشق ہی کے توسط سے آیا ہے:

جتنے دھن جوبن کی مستی کرے سو ہو خجل آخر
کہ اے نصرتی کسی پر یو بقا مدام نئیں ہے

نصرتی کا اصل کمال مثنوی ہی میں ظاہر ہوتا ہے جس میں کوئی اس کا ثانی نہیں، قصیدے میں بھی اس کا جوہرِ طبع خوب نکھرتا ہے مگر غزل میں وہ بلندی نہیں ہے۔ تمام دکنی شعرا کے ہاں صنفِ غزل میں طبع آزمائی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ اس دور میں مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے اور مشاعروں میں شرکت کے لئے غزل کہنا ضروری ہے۔ نصرتی کی غزل بھی اسی روایت کا تسلسل ہے۔ اس کی غزل میں حسن و عشق کا تصور عورت کے جسم سے پیاس بجھانے تک محدود ہے۔ اپنی مثنویوں ''علی نامہ'' اور ''گلشنِ عشق'' میں اس نے عشق کا جو بلند تر تصور پیش کیا ہے، اس کی غزل اس کے بالکل برعکس ہے۔

علی عادل شاہ، شاہی (۱۶۳۸ء۔ ۱۶۷۲ء)

یہ سلطنتِ بیجا پور کا آٹھواں فرمانروا تھا۔ علم و ادب اور شعر و سخن سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ خود بھی شعر کہتا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ اس کی غزلیات کی کل تعداد ۲۰ ہے جن میں اشعار کی تعداد پانچ سے لے کر چودہ تک ہے۔ اس کی غزل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پوری غزل میں تقریباً ایک ہی موضوع ادا ہوتا ہے۔ اسے موسیقی سے گہرا شغف تھا۔ اس نے ہندوی زبان میں فنِ موسیقی پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ''نورس'' ہے۔ یہ کتاب اس کی شہرت کا اصل سبب ہے۔ اس کی غزلیات دکن کی اسی روایت کا حصہ ہیں جس میں حسن و عشق کا تصور صرف جسمانی لذت تک محدود ہے۔ اس کے طبعی جوہر غزل کی نسبت قصیدے میں زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس نے کل چھ (۶) قصیدے کہے ہیں۔ پہلے حمدیہ قصیدے میں اس کے تصورِ انسان پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے:

> ''قصیدے کا مضمون یہ ہے کہ خدا نے انسان کو سب سے بڑی چیز جو دی ہے وہ عقل ہے یہی کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ جسم کے قلعے میں سدا عقل کا حکم چلتا ہے۔ عقل کی خلوت میں فکر کو رائے زن بنایا گیا ہے۔ جس کی عقل کامل ہے وہی حق کو پا سکتا ہے۔۔۔ حق نے خاک سے پتلے بنائے۔ آب و آتش، خاک و باد سے ہمارے جسموں کو سنوارا۔ پھر ان میں روح بھری۔۔ اسی نے کالے اور گورے رنگ کے لوگ پیدا کیے اور ہر طرح کے لوگوں کو

پیدا کر کے رنگارنگی کا تماشا دکھایا۔ پھر عبادت کے لئے انسان کے دل میں عشق کا جذبہ پیدا کیا۔اس جذبۂ لطیف کے ذریعے حرص و ہوا سے محفوظ رکھا۔"۸

اس تصور پر مذہب کے ساتھ ساتھ صوفیانہ نظریات کی چھوٹ پڑتی ہے۔ مساواتِ انسانی یعنی رنگ و نسل اور زبان کا فرق صرف رنگارنگی کے لئے ہے۔ انسانی عظمت کی عمارت عقل کی بنیاد پر استوار ہے۔ جذبۂ عشق دنیاوی لالچ اور خواہشِ نفس سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ یہی جذبہ انسان کو عبادت پر آمادہ کرتا اور خدا رسیدگی کا سبب ہے۔

میراں خاں ہاشمی (وفات:۱۶۹۷ء)

یہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ممتاز شاعر تھا۔ مہدوی فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور شاہ ہاشم مہدوی کا مرید تھا۔ شاہ ہاشم نے اسے اپنے نام کی مناسبت سے ہاشمی تخلص سے نوازا تھا۔ اس کی مثنوی۔"یوسف زلیخا" میں عشق کی نوعیت حقیقی ہے۔ اس نے مرثیوں اور مثنویوں کے علاوہ ریختی میں بھی ایک دیوان مرتب کیا جو اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلا دیوان ہے ۔اس کا کلام اپنے عہد کی سماجی اور اخلاقی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور علی عادل شاہ ثانی کی غزلیات میں بھی بعض مقامات پر ہندی روایت کے تتبع میں عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کی مثالیں ملتی ہیں اس کے ہم عصر غواصی کے ہاں بھی ریختی گوئی پائی جاتی ہے اور ان دونوں کی ریختیوں میں بڑی مماثلت بھی موجود ہے۔ اس لئے ہاشمی کو ریختی کا موجد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا امتیاز اس صنف میں دیوان ترتیب دینا ہے۔

ہاشمی کی غزل میں محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بہت زیادہ ہوا ہے کیوں کہ اس کی غزل میں عورتوں کی تہذیب، طرزِ فکر، جنسی زندگی کی نفسیات اور اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کا خانگی زندگی پر اثر وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے ۔ان میں زندگی کی کم ثباتی اور کچھ اخلاقی نکات بھی ملتے ہیں اور یہ محاورات اور ضرب الامثال کسی جذبے یا تمنا کے بیان یا معاملہ بندی کے بیان میں ضمناً استعمال ہوئے ہیں. ظاہر ہے کہ ان کے ذریعے اس کی اخلاقی ترجیحات کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ان اشعار میں زندگی کی کم ثباتی کا ذکر ہے:

جیتے ہیں لگ تو مل رہنا بڑی یہ کچھ غنیمت ہے
جیے دن کون جیتا ماں، بھروسہ ہے کسے دم کا۹

خوش حالی ہوے ملے پر بچھڑے کی دل گری ہے
یوں ہاشمی نفع کیا یک تل گھڑی ملی کا۱۰

ایک اور شعر میں اگرچہ معاملہ بندی پائی جاتی ہے مگر محاورہ ایسا استعمال ہوا ہے جس میں اخلاقی قدر کا تذکرہ ہے کہ نفع بخش چیز کو لالچ کی وجہ سے جڑ بنیاد سے نہیں ختم کر دینا چاہیے:

کہی دھن ہاشمی چھوڑو میٹھا ہے نیشکر تو بھی
جڑوں پیڑوں سے نئیں کھاتے، مرے تو تھے بجو کے لب۱۱

ان اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہاشمی نے اگر اپنے دور کے زنانہ رخ کی سماجی اور اخلاقی تصویر کشی کی ہے تو اس کا انداز کیسا رہا ہو گا۔

ولی دکنی (۱۶۶۸ء۔۱۷۰۷ء)

ولی دکنی سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے سنگم پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ زندگی کے ابتدائی اٹھارہ، اُنیس برس انہوں نے دکن کی باجگزار ریاستوں کے شہری کے طور پر بسر کیے اور بعد کی زندگی مغلیہ دور کے دکن میں گزاری۔ جنوبی اور شمالی ہند کے تہذیب و تمدن کے ادغام کا انہوں نے نہ صرف بہت قریب سے مشاہدہ کیا بلکہ وہ خود اس کا حصہ رہے۔ وقت کے اعتبار سے وہ دو صدیوں کے سنگم پر کھڑے ہیں تو تہذیبی حوالے سے وہ جنوبی اور شمالی ہند کے اقدار و تہذیب کے سنگم پر جی رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں شمالی اور جنوبی ہند کی روایت کے زندہ عناصر کو دلنشین امتزاج سے ایک نیا رنگ دینے کی کامیاب کوشش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری گذشتہ تین صدیوں سے زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ ذوق کی سیرابی کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی انہیں پہلا کلاسیکی شاعر قرار دیتے ہیں کیونکہ ان سے پہلے غزل کی روایت رومانوی رنگ کی حامل ہے۔

۱۷۰۰ء میں ولی کا سفر دہلی خود ان کے فکر و فن کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر اُردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں انہیں سعد اللہ گلشن نے زبان فارسی کے اسلوب اور مضامین کو اُردو میں نظم کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ان کے کلام میں شمالی اور جنوبی ہند اور فارسی اور ہندی روایت کا ایک اعلیٰ درجے کا فنی و فکری امتزاج سامنے آیا۔

ولی جس دور میں زندگی گزار رہے تھے اس میں فکری اور سماجی سطح پر تصوف کا دور دورہ تھا۔ نظم و نثر میں مضامینِ تصوف صراحت سے بیان ہو رہے تھے۔ معاشرے میں بھی تصوف کا نظامِ اخلاق ہی رائج تھا۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

> "تصوف اس زمانے میں فکر اور اخلاقی بلندی کا معیار تھا، وحدت الوجود کا عقیدہ، جذب، سلوک اور معرفت کے لئے واحد بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیاقت، علمیت، بلند اخلاقی اور بلند نظری سب میں یہی صوفیانہ طریق رچا ہوا تھا۔ ولی کے بعد بھی تیرہویں صدی ہجری یعنی میر و سودا کے آخری عہد تک یہی نظریہ مذہب، اخلاق اور شعر و ادب میں ہندو اور مسلمان قوموں میں بڑی وسعت کے ساتھ رائج تھا۔ چنانچہ ولی نے بھی اس مسلک کو نہ صرف اپنی زندگی میں برتا بلکہ شاعری میں بھی اس خوبی سے اظہار کیا کہ ان سے پہلے کسی نے اُردو میں اتنی کامیابی سے نہیں برتا ۔"[۱۲]

ولی دکنی کے ہاں انسان کا تصور بھی اسی نظریۂ تصوف کے زیر اثر پیدا ہوا۔ انسان اس جہان کی وہ گراں بہا مخلوق ہے جس کو حسنِ مطلق نے خود اپنے لیے خلق کیا اور پھر باقی کائنات اس کی خاطر خلق فرمائی اور اس کے لئے مسخر کر دی گئی:

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ[۱۳]

بس کہ اے نورِ عین تجھ میں ہے انسانیت
عشق سوں تیرے صنم صورتِ انسان ہوا[۱۴]

مسجودِ آفتاب ہوا ہے شرف سوں آج
وہ نقشِ پاک زینتِ روئے زمین ہوا[۱۵]

قرآنِ حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جب ملائکہ کے سامنے تخلیقِ آدمؑ کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ کیا اس کو خلیفہ بنایا جائے گا جو زمین پر خون بہائے اور فساد برپا کرے گا۔ ولی کہتے ہیں کہ تخلیق کے بعد جب وہ اس کی شان سے آگاہ ہوئے تو اس کے لئے دعا گو ہوئے کیوں کہ اس نفس میں "جمالِ حق" کا اظہار ہو رہا تھا۔

دیکھ تجھ میں جمالِ حق کا ظہور
ہیں دعا گو فلک پہ سارے ملک۱۶

ولی کے ہاں انسان کے حوالے سے ایک تو یہ انداز ہے جو ابھی بیان ہوا ہے مگر دوسری طرف ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جہاں وہ ملائک کو انسان پر فوقیت دیتے ہیں یہاں ایسے تین شعر درج کیے جاتے ہیں جن میں انہوں نے ایک ہی ترکیب "حدّ ِبشر" کو مختلف انداز میں استعمال کیا ہے اور فہم ملائکہ کو عقل انسانی پر فوقیت دی ہے:

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی
باہر ہے تیری فکر رسا حدِّ بشر سے۱۷

تری تعریف کرتے ہیں ملائک
ثنا تیری کہاں حدِّ بشر ہے۱۸

پہلا شعر تو تعلی کا ہے اگرچہ قدسیوں کے مقابلے میں انسانی فکر کو کمتر ظاہر کیا گیا ہے مگر چوں کہ شعر بھی ایک بشر ہی کہہ رہا ہے تو اس سے انسانی فہم کی علویت ہی ظاہر ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے شعر میں اللہ کی حمد و ثنا کو حدِّبشر سے بلند تر چیز قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے مگر یہاں اس حوالے سے فرشتوں کی انسان پر فوقیت کا تاثر موجود ہے اگلا شعر عظمتِ حق تعالیٰ کا مضمون لیے ہوئے ہے اور اس میں جس عجزِ انسانی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بالکل حقیقت ہے البتہ اس میں بھی ترکیب حدّ بشر ہی استعمال ہوتی ہے۔

ولی اس کی حقیقت کیوں کہ بوجھے
کہ جس کا بوجھنا حدِّ بشر نئیں۱۹

ولی کے ہاں انسانی فضیلت کا تذکرہ بار بار ہوا ہے۔ وہ اشرف الخلائق ہے اس لئے وہ ہر مخلوق کی آواز ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تمام مخلوقات کے مقصد و مدعا سے آگاہ ہو جائے۔ وہ عاشقِ حسن حقیقت ہے۔ یہ جلوۂ حسن ایسا ہے جس کے حسن کی کوئی حد نہیں۔ صوفیانہ فکر کے زیر اثر ان کو ہر شے میں اسی حسن کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول:

"یہ تصوف ہی کا فیضان تھا کہ ان کی آنکھیں باہر کی طرف کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ زندگی کے خارجی پہلوئوں پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کے حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہر چیز میں انہیں وہ جلوہ نظر آتا ہے، جس کے گرد تصوف کا پورا نظام گھومتا ہے۔"۲۰

کائنات میں انسانی مرکزیت کا یہی احساس ہے کہ وہ خود کو ہر غنچہ دہاں کا بلبل قرار دیتے ہیں:

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا۲۱

انسان کے بحثیت خلیفۃ اللہ، مقام و مرتبے کا تقاضا ہے کہ اس میں مخصوص اخلاقی اوصاف موجود ہوں۔ اس میں عجز و انکساری، خوش گفتاری، خاکساری، احترامِ انسانیت بلکہ احترامِ جملہ مخلوقات کا پایا جانا ضروری ہے۔ تصوف میں بھی اخلاقیات پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک خلائق سے محبت کا رشتہ ہی اصل انسانیت ہے۔ بلندی کے سارے راستے یہیں سے آگے بڑھتے ہیں یہ شرف کے سفر کی پہلی سیڑھی ہے۔ جو اپنی ذات پر تصرف حاصل کر لے، اپنی انا کو زیر کر لے، خلقِ خدا سے محبت اور احترام کا رشتہ استوار کرے وہی اصل انسانیت کے راستے پر ہے۔ ولی کے ہاں بھی ایک نظامِ اخلاق کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ اخلاقی خصائص جو آدمیت کی پہچان ہیں۔

"ولی کی شاعری میں ایک نظامِ اخلاق اور ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی کی خواہش ہے۔ تصوف نے ان کی شاعری میں درویشانہ اور قلندرانہ فکر پیدا کی، ولی کے خیال میں محبوبِ حقیقی کی تمام تر صفات کائنات میں موجود ہر شے میں جلوہ ریز ہیں۔"۲۲

محبوبِ حقیقی کا جلوہ کائنات کی ہر شے میں موجود ہے اور انسان اس کا سب سے بڑا اور جامع مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُخروی کامیابی کے لئے اخلاقِ حسنہ کو لازم قرار دیا ہے:

گر عاقبت کے ملک کی خواہش ہے سلطنت
خوش خصلتی کے ملک میں اے خوش خصال چل۲۳

خوش خصلتی فقر واستغنااور دنیا سے بے نیازی کا نتیجہ ہے، نفس کشی سے ہی خوش خصلتی کا آغاز ہوتا ہے کوئی جس حد تک اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے اسی قدر خوش خصلت ہو جاتا ہے اور یہی اخلاقیات کی جڑ بنیاد ہے۔

نفسِ سرکش پہ جو کئی پایا ہے یاں فتح و ظفر
دارِ عقبیٰ کے بھیتر الحق وہی منصور ہے۲۴

نفس کو زیر کر لینے کے بعد ہی انسان حقیقت میں اعلیٰ انسانی درجے کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ پھر دنیا ایک غلام کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور اسے دنیا کو نظر اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر
مشتاق نئیں سکندری کا
پھیکی لگے اس کو شان و دولت
چاکھیا جو مزا قلندری کا۲۵
نکال خاطرِ فاتر سوں جام کا غم
صفا کر آئینۂ دل، سکندری یہ ہے۲۶

نفس کشی ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان کے اندر ایک نہایت قیمتی قدرِ انسانی, فروتنی ،انکساری اور تواضع پیدا ہوتی ہے ۔اگر یہ صفت پیدا کر لی جائے تو حسد، کینہ ،لالچ اور تکبر جیسے رذائل انسان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے

عجب کچھ بُوجھ رکھتے ہیں سر آمد بزمِ معنی کے
تواضع نئیں ہے جس میں اس کوں انسان کر نہیں گنتے۲۷

خاکساری جس کو سلطانی ہے اس عالم منیں
کاسۂ خالی اسے جیوں چینی فغفور ہے۲۸

ہر اک سے مل متواضع ہو سروری یہ ہے

سنبھال کشتیِ دل کوں قلندری یہ ہے۲۹

اسے تیغِ غم سوں خوف نئیں
خاکساری بدن پہ جوشن ہے۳۰

جب انسان اپنی انا پر قابو پا کر خاکساری اور تواضع اختیار کر لیتا ہے تو اس کی زبان محبت کے ترانے گانے لگتی ہے، اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کی گفتار دُکھی دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے۔ وہ اس دنیا سے گزر جائے تب بھی اس کا حرفِ محبت زندہ رہتا ہے اور انسان کی تشفیِ خاطر کا کام کرتا ہے۔ اصل قوت اور اختیار تو خوش گفتاری ہی میں پوشیدہ ہے۔

جس کی گفتار میں نئیں ہے مزا
سخن اس کا بعام باسی ہے۳۱

اے سکندر نہ ڈھونڈ آبِ حیات
چشمۂ خضر خوش بیانی ہے۳۲

ایک اور گراں بہا قدرِ انسانی مروت ہے۔ لوگوں کے دل رکھنا، کڑوی کسیلی سے گریز کرنا، تالیفِ قلب کی کوشش کرنا وغیرہ، خوش بیانی کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مروت بھی مذہبِ اسلام اور صوفیانہ نظامِ اخلاق میں بڑی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اسی کی بدولت انسانی تعلقات استوار ہوتے اور قائم رہتے ہیں۔

مروت کے ہمیشہ ہاتھ میں ہے
عنان اختیار آشنائی (۳۳)

مذہبِ اسلام اور مسلکِ تصوف میں احترامِ انسانی کی بڑی قدر و قیمت ہے انسان سب برابر ہیں بلکہ تصوف تو اس سے ایک قدم آگے جا کر تمام مخلوقات کو ایک درجے میں رکھنے پر زور دیتا ہے کیونکہ سب کا صانع، صنّاعِ حقیقی ہے۔ اسی لئے صوفیا کے ہاں رنگ، نسل، علاقے، زبان اور مذہب کی تقسیموں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ یہاں وسیع المشربی کا درس دیا جاتا ہے اور انسانی مساوات پر زور دیا جاتا ہے۔

جو کئی ہر رنگ میں اپنے کو شامل کر نہیں گنتے

ہمن سب عاقلاں میں اس کوں عاقل کر نہیں گنتے۳۴

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سجہ و زنّار کا۳۵

مذہب اور تصوف میں گناہوں پر نادم ہونے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے توبہ کی قبولیت کے لئے ندامت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔یہ تکبر کی کاٹ کرتی ہے اور نفسِ انسانی کی تہذیب کا موئثر ہتھیار ہے۔

سیاہ روئی نہ لے جا حشر میں دنیائے فانی سوں
سیہ نالے کوں دھو اے بے خبر انجھواں کے پانی سوں۳۶

ہم کو شفیعِ محشر وہ دیں پناہ بس ہے
شرمندگی ہماری عذرِ گناہ بس ہے۳۷

ولی کے ہاں زاہد، ناصح اور واعظ پر پھبتی کسنے کا رویہ بھی موجود ہے۔صوفیانہ فکر کے حوالے سے یہ ایک منفی رویہ ہے ۔لیکن ولی اس کے ذریعے بھی حقیقت میں درسِ اخلاق کا سامان کرتے ہیں۔وہ اس طریقے سے سخت دلی اور ریاکاری کی مذمت کرتے ہیں۔

> ''اس قسم کی شاعری کا مقصد اخلاق سے نفرت دلانا نہیں بلکہ سچے اخلاق کی طرف لانا ہے۔۔۔وہ منافقت، سنگدلی اور قول و فعل کے تضاد کی مذمت کرتے ہیں۔جہاں وہ خود ناصح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ان کی شاعری میں تعمیم کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے سمندر میں گہرا غوطہ لگا کر وہ عقل و دانش کا ایک سچا موتی لائے ہیں۔یہ وہ رنگِ سخن ہے جو آئندہ شاعری میں بہت مقبول ہوا۔''۳۸

زاہد کو مثلِ دانۂ تسبیح ایک آن
کوچے ستی ریا کے نکلنا محال ہے۳۹

آلودہ کیوں نہ ہووے دامانِ پاک زاہد
جب دستِ نازنیں میں جامِ شراب ہووے[۴۰]

حقیقت سوں تیری مدت ستی واقف ہیں اے زاہد
عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا[۴۱]

کلامِ ولی میں غم واندوہ اور مایوسی و نارسائی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ محققین کے نزدیک اس کی ایک وجہ تو مسلکِ تصوف سے وابستگی ہے اور دوسرے انہوں نے اپنی زندگی میں غموں کا سامنا بھی نہیں کیا۔ ان کے ہاں ایک شگفتگی اور بشاشت کا انداز ملتا ہے۔ رنج و محن اور گریہ و زاری ان کے ہاں مفقود ہے۔ البتہ ان کے کلام میں انسانی زندگی کی کھٹنائیوں اور غم کا تذکرا کادکا اشعار میں بڑے موئثر انداز میں ہوا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر زندگی کو غم کا دوسرا نام بتایا ہے اور ایک مقام پر مفلسی کی تکلیف کا ذکر بھی بڑے موئثر انداز میں کیا ہے۔

اس کو حاصل کیوں کہ ہوئے جگ میں فراغِ زندگی
گردشِ افلاک ہے جس کو ایاغِ زندگی[۴۲]

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے[۴۳]

ولی سے قبل دکنی غزل کی روایت میں ایسے موضوعات کو بالکل جگہ نہیں دی گئی۔ ولی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو غزل میں فکری، سماجی اور مذہبی غرض تمام انسانی پہلوئوں پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اُردو غزل کے لئے موضوعاتی سطح پر نئے امکانات روشن کیے اور فنی سطح پر بھی ولی کی غزل عرصۂ دراز تک اہلِ سخن کے لئے قابلِ تقلید رہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ اُردو ادب کی تاریخ، ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱۹

۲۔ڈاکٹر جمیل جالبی۔تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل)۔لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب،۲۰۱۳ء، ص۲۹۰
۳۔حسن شوقی۔دیوانِ حسن شوقی۔ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتب)۔کراچی: انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان،۱۹۷۱ء، ص۱۷۳
۴۔ڈاکٹر جمیل جالبی۔تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل)۔لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب،۲۰۱۳ء، ص۴۱۸
۵۔محمد قلی قطب شاہ۔کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ۔ڈاکٹر سیدہ جعفر (مرتب)۔نئی دہلی: ترقیِ اُردو بیورو،۱۹۸۵ء،۴۸۱
۶۔ملّا نصرتی۔دیوانِ نصرتی۔جمیل جالبی (مرتب)۔لاہور: قوسین تھارنٹن روڈ،۱۹۷۲ء، ص۱۴
۷۔ایضاً، ص۷۰
۸۔علی عادل شاہ شاہی۔کلیاتِ شاہی۔سید مبارز الدین رفعت (مرتب)۔علی گڑھ: انجمنِ ترقی اُردو،ہند،۱۹۶۲ء، ص۴۱۔۴۲
۹۔میراں خاں ہاشمی۔دیوانِ ہاشمی۔ڈاکٹر حافظ قتیل (مرتب) حیدر آباد دکن: ادارۂ ادبیاتِ اُردو،۱۹۶۱ء، ص۱۶
۱۰۔ایضاً، ص۳۰
۱۱۔ایضاً، ص۳۸
۱۲۔ولی دکنی۔کلیاتِ ولی۔ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (مرتب)۔دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،۲۰۰۸ء، ص۳۸
۱۳۔ایضاً،۶۲
۱۴۔ایضاً، ص۹۷
۱۵۔ایضاً، ص۹۸
۱۶۔ایضاً، ص۶۱
۱۷۔ولی دکنی۔دیوانِ ولی (انتخاب)۔محمد خان اشرف/حسرت موہانی (مرتب) لاہور: مکتبہ میری لائبریری،۱۹۷۷ء، ص۶۵
۱۸۔ولی دکنی۔کلیاتِ ولی۔ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (مرتب)۔دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،۲۰۰۸ء، ص۲۶۸
۱۹۔ایضاً، ص۲۰۶
۲۰۔ڈاکٹر عبارت بریلوی۔ولی اورنگ آبادی۔لاہور: ادارۂ ادب و تنقید،۱۹۸۱ء، ص۷۴
۲۱۔ولی دکنی۔کلیاتِ ولی۔ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (مرتب)۔دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،۲۰۰۸ء، ص۶۱
۲۲۔ڈاکٹر نفیس اقبال۔اُردو شاعری میں تصوف، میر و سودا اور درد کے عہد میں۔لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز،۲۰۰۷ء، ص۱۱۵
۲۳۔ولی دکنی۔کلیاتِ ولی۔ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (مرتب)۔دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان،۲۰۰۸ء، ص۱۵۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۸۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۸۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۲۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۷۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۸۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۹۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۹۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۹۶

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۰۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۳۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل)۔ لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۱۳ء، ص، ۵۴۶۔ ۵۴۷

۳۹۔ ولی دکنی۔ کلیاتِ ولی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (مرتب)۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۴۱۔ ایضاً، ص ۸۶

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۹۰